يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ؕ (5:67)

اے رسُولؐ! اِس ضابطۂ حیات کو جو تُمہارے ربّ کی طرف سے تُم پر نازل کیا گیا ہے تمام اِنسانوں تک پہنچادو۔

اے بندۂ مومن! تو کجائی! تو کجائی!

اقبالؒ کا مردِ مومن

علامہ اقبالؒ کے یوم وفات کی تقریب پر

پرویز صاحب کا خطاب (اپریل 1974ء)

ادارہ طلوعِ اِسلام

25-B، گلبرگ 2، لاہور فون: 042-35714546

Email: idara@toluislam.com

Web: www.toluislam.com

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لئے

ماھنامہ

طلوعِ اسلام

خود پڑھیئے،

دُوسروں کو پڑھنے کے لیے پیش کیجیئے

یہ

ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے جس کا مقصد قرآنی فِکر کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوانوں کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے

صحیح آسمانی اِنقلاب بن کر اُبھرے!

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی کل آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے

سالانہ زرشرکت اندرون ملک -/450 روپے۔ بیرون ملک -/2500 روپے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ

بنام ادارہ طلوع اسلام B-25 گلبرگ 2' لاہور ارسال فرمائیں۔

بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 برانچ کوڈ 0465

نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ' لاہور۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اے بندۂ مومن! تو کجائی! تو کجائی!

اقبالؒ کا مردِ مومن

علامہ اقبالؒ کے یوم وفات کی تقریب

پرویز صاحب کا خطاب (اپریل 1974ء)

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

ہم آج ایک ایسی واجب الاحترام ہستی کا یومِ وفات منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ملت ِ اسلامیہ کا بالعموم اور ہم اہل پاکستان کا بالخصوص عظیم محسن ہے۔ پوری ملت کا اس لئے کہ اس نے خدا کی اس کتاب جلیل کو جسے ہم نے صدیوں سے نقش ونگارِ طاقِ نسیاں بنا کر رکھ چھوڑا تھا اور جس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ''کہ از یٰسین او رآساں بمیری''۔ پھر سے کتابِ زندہ کی صورت میں پیش کیا۔ اور اہل پاکستان کا اس لئے کہ اس نے اس بے مقصد مصروفِ دشت پیمائی اور صحرا نوردی قوم کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین رکھا۔ یعنی ایک ایسی آزاد مملکت کا تصور جس میں اسلام پھر سے ایک عملی نظام کی حیثیت سے کارفرما ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ کے یہ بہت بڑے احسانات ہیں جن سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ان کے احسانات کا یہی احساس ہے جس کی بنا پر میں 1938ء سے آج تک ان کے زندگی بخش پیغام کی یاد تازہ کرائے چلا آ رہا ہوں اور یہی آج کے اجتماع سے بھی مقصود ہے۔ ''پیغام اقبالؒ اور قرآنِ کریم'' میرا مخصوص موضوع ہوتا

ہے۔اس موضوع کے متنوع گوشے ہیں جنہیں بہ تمام وکمال کسی ایک نشست میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ایک نشست میں ان میں سے کوئی ایک گوشہ ہی سامنے لایا جاسکتا ہے۔میں آج جس گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں اس کا عنوان ہے ''اقبالؒ کا مردِ مومن''۔اس موضوع تک پہنچنے کے لئے ایک تمہید ناگزیر ہے......ایسے ہی ناگزیر جیسے فصل بونے کے لئے زمین کا ہموار اور نرم کرنا ناگزیر ہوتا ہے کہ ''تمہید'' کے بنیادی معنی یہی ہیں۔اور اقبالؒ تو خود اس دنیا کی زندگی کو مزرعِ آخرت کی تمہید قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

زمینِ خاکِ درمیخانۂ ما فلک یک گردشِ پیمانہ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اور ہمارے موضوع کی تمہید یا دیباچہ یہ ہے۔

تمہید

قرآنِ کریم' داستانِ حیات کو بڑے عجوبانہ لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ زندگی' ناقابل نمو' جامد مادہ (INORGANIC MATTER) میں محوخواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس کی آنکھ کھول دی۔یوں پانی اور مٹی کے امتزاج سے اوّلین جرثومۂ حیات وجود میں آیا۔یہ جرثومہ جوشِ نمو سے دوحصوں میں بٹ گیا جس سے نرو مادہ کا امتیاز عمل میں آ گیا اور ان کے اختلاط سے کاروانِ حیات' شاخ در شاخ مختلف سمتوں میں بڑھتا' پھولتا' پھلتا' رواں دواں پھیلتا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔تآنکہ وہ کروڑوں سال کی منزلیں طے کرتا اور پہلو بدلتا پیکرِ حیوانی میں نمودار ہو گیا اور جب اس نے ایک ارتقائی جست اور آگے لگائی تو زندگی نے لباسِ بشریت اختیار کر لیا۔[1]

یورپ کے سائنس دان اپنی صدیوں کی تحقیق وکاوش کے بعد اُس نتیجہ پر پہنچے ہیں جسے قرآن

1۔ میں نے اس مقام پر محض اشارات سے کام لیا ہے۔تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ''ابلیس وآدم'' میں ملے گی۔

نے چودہ سوسال پہلے ان اشارات میں بیان کر دیا تھا۔لیکن اس کے بعد حکمائے مغرب کے نظریہ اورقرآنی حقائق میں ایسا ناقابل مفاہمت اختلاف سامنے آتا ہے جسے کفر اورایمان کے افتراق سے تعبیر کیا جائے گا۔مغربی محققین کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔بجز اس کے کہ انسانی شعور کی سطح ذرا زیادہ بلند ہے۔دونوں فطرت کے طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے کھاتے پیتے' افزائش نسل کرتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔موت کے ہاتھوں جس طرح دیگر حیوانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔بالفاظ دیگر' انسانی پیکر' ارتقاء کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہے۔اس کے بعد فنا ہے۔قرآنِ کریم اس تصورِ حیات کو کفر' یعنی حقیقت سے انکار قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ [47:12] حقیقت سے انکار کرنے والے (یعنی کفار) حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔یعنی کھاتے پیتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ فطرت کا وہ تخلیقی پروگرام جس کی ابتداء اس قدر معجزانہ انداز سے ہوئی' پھر کاروانِ حیات جس انداز سے مختلف وادیوں میں سے گزرا۔اس نے جس طرح انواع واقسام کے کروڑوں پیکر اختیار کئے۔اپنی خاصیتیں بدلتیں' نوعیتیں تبدیل کیں۔اس میں ایسے ساحرانہ تغیرات نمودار ہوئے کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ عروسِ حیات جو بہ ہزار عشوہ ورعنائی پیکرِ انسانی میں کھڑی مسکرا رہی ہے' وہی ہے جس کا آغاز ایک جرثومہ حیات سے ہوا تھا۔ذرا سوچو کہ یہ تمام محیر العقول پروگرام۔یہ حیرت بدوش زندگی۔یہ سرتاسر طلسماتی منزلیں۔اس تمام نظامِ ارتقاء کا ماحصل یہی تھا کہ موت کی ایک ٹھوکر اس کارگہِ نمود ووجود کو مٹی کے گھروندے کی طرح پامال کر کے رکھ دے؟ سوچو کہ یہ تصور کس قدر بے معنی اور یہ نظریہ کیسا بعید از قیاس ہے! لعبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را۔قرآن نے کہا کہ پیکرِ بشریت سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں۔یہ ایک جدید سلسلہ ارتقاء کی اوّلین کڑی ہے۔یہاں سے کاروانِ حیات ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے۔انسانی زندگی اس کے طبعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات' نفس یا خودی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اس سے پہلے مقصود صرف طبعی جسم کی نشوونما تھا لیکن اب مطلوب انسانی ذات کی نشوونما ہے۔انسانی جسم کی نشوونما دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانین کی رُو سے ہوتی ہے۔لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان غیر متبدل اقدار کی رُو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی رہی ہیں اور جواب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی جسم کی نشوونما کیسے ہی لطیف و نفیس انداز سے کیوں نہ ہو وہ انسانی جسم ہی رہتا ہے۔ ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچتا۔لیکن جب انسانی ذات کی نشوونما سے' انسان' سلسلۂ ارتقاء کی اگلی اور بلند منزل میں پہنچ جاتا ہے' پھر موت سے اس کا جسم تو پیوندِ خاک ہو کر ختم ہوجاتا ہے لیکن اس کی ذات کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔جس انسان میں اس کی ذات کی نشوونما شروع ہوجائے اُسے قرآن کی اصطلاح میں مومن کہا جاتا ہے۔دیؔن (یعنی اسلامی نظامِ حیات) کا مقصد انسان کو مومؔن بنانا ہے۔ قرآنِ کریم وہ ضابطہ زندگی یا پروگرام عطا کرتا ہے جس کی رُو سے ایک انسان' مردِ مومن بن سکتا ہے۔اس پروگرام کی رُو سے' حسنات وہ اعمال ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور تعمیر ہوتی ہے اور سیئات وہ کام جن سے اس کی تخریب ہوتی ہے۔ یہی خیر و شر کا نقطۂ امتیاز اور نیکی اور بدی کا معیار و مقیاس ہے۔

آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مغرب کے تصورِ حیات اور قرآنی تصور کا فرق محض نظری (THEORETICAL) یا سائنسی تحقیق کے نتائج کا فرق نہیں۔ یہ ایسا بنیادی فرق ہے جس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ......معاشرتی' معاشی' سیاسی' تمدنی وغیرہ' اساسی طور پر متاثر ہوتا ہے اسی وجہ سے قرآن نے اُسے کفؔر اور ایماؔن کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ مغربی نظریہ کی رُو سے انسانی زندگی محض طبعی زندگی ہے جو دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانینِ فطرت کے تابع رہتی ہے۔ اس زندگی میں طبعی قوانین سے ماوراء یا بلند کوئی اور قانون نہیں۔ یہ جو آپ اقوامِ مغرب کے ہاں ہر جگہ ''جنگل کا قانون'' کارفرما دیکھتے ہیں تو یہ اسی نظریانہ زندگی کا عملی اور فطری نتیجہ ہے۔اسی کو سیکولؔرازم یا لادینیت کہا جاتا ہے اور جس جہنم میں آج ساری دنیا ماخوذ ہے وہ

اسی نظریہ کے برگ و بار ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد زیر گردوں رسم لادینی نہاد
در نگاہش آدمی آب وگل است کاروانِ زندگی بے منزل است

(پس چہ باید کرد۔ صہ 56)

آپ نے دیکھا کہ سائنس کا ایک غلط نظریہ کس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے کو زیروزبر کر دیتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کی رُو سے دیؔن اور دنیؔا میں کوئی مغائرت یا ثنویت نہیں تو اس سے یہی مراد ہے۔ جب تک انسانی زندگی کے متعلق اقوامِ مغرب کا زاویہ نگاہ نہیں بدلتا' وہاں کے سیاسی' معاشی' معاسرتی نظام میں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس غلط نظریہ حیات کے تخریبی نتائج نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر اب یورپ کے مفکر رفتہ رفتہ اس طرف آ رہے ہیں کہ انسانی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں۔ اس سے آگے کچھ اور ہے اور اب مزید ارتقاء طبعی جسم کا نہیں بلکہ اس کے انسانی مضمرات کا ہوگا۔ روؔس کا مشہور مفکر اوؔس پینکی اپنی مشہور کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS) میں لکھتا ہے:۔

> اب انسانی ارتقاء کا مفہوم ہے ان قویٰ اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پاسکتیں یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہوسکتی صرف اس نہج کی نشوونما صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کا حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جا سکتا۔

برگساؔن اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ اب ارتقائی منازل سے مقصود یہ ہے کہ ''انسان ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے نوعِ انسان پر عاید کر رکھی ہیں''۔

(TWO SOURCES OF MORAILTY AND RELIGION)

اور پروفیسر آرتھر تھامسن اپنی کتاب (GOSPEL OF EVOLUTION) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ:۔

ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ہکسلے نے یہ غلط کہا تھا کہ کائناتی تجربہ کا اخلاقی مقاصد سے کچھ تعلق نہیں۔اس کے برعکس، ہم پروفیسر (FATRICK GEEDS), سے متفق ہیں کہ فطرت درحقیقت اخلاقی عمل ہی کی مادی شکل کا نام ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ حقیقت، ارتقائی کتابِ مقدس کا نہایت اہم جزو ہے۔ حیوانات سے ہمارا تعلق اب ہمیں ملائکہ کی طرف لئے جارہا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات اب خالص مادی نظریۂ ارتقاء کو باطل قرار دے کر کس طرح انسانی ارتقاء کی طرف آرہے ہیں لیکن چونکہ قرآن کی شمعِ تابندہ ان کے سامنے نہیں اس لئے مزید ارتقائی منازل کے راستے اور ان کے طے کرنے کا پروگرام، ہنوز نکھر اور اُبھر کر ان کے سامنے نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی ہوجائے گا کہ اس کے سوا انسان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔

مستقل اقدار

میں نے پہلے کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ان اقدار کی اصل وحقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے کرایا ہے۔جنہیں الاسماء الحسنٰی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ان صفات یا اسماء کی رُو سے ذاتِ خداوندی کے مختلف گوشوں کی جھلک سامنے آتی ہے۔انسانی دنیا میں انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ان میں سے کچھ تو ایسی صفات ہیں جو ذاتِ خداوندی سے مختص ہیں۔ مثلاً ھوالاول و الاخر۔ ھوالظاھر والباطن۔یعنی اس کا زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہونا۔یا فاطر السمٰوٰت والارض۔کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔اس قسم کی صفات کے سوا، باقی ایسی ہیں جنہیں انسان علیٰ حد بشریت، اپنی ذات میں منعکس کر سکتا ہے۔انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔قرآن نے انہیں صِبْغَةَ اللهِ (2:138) یا اللہ کا رنگ کہہ کر پکارا ہے۔جوں جوں انسان ان صفات کو اپنی ذات میں منعکس کئے جاتا ہے، اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔قرآن میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی پر نگاہ ڈالئے، یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان میں

سے بیشتر صفات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ مثلاً خدا غفور الرحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ وہ عفو کریم بھی ہے اور جبار و متکبر بھی۔ ان صفات میں باہمد گر تضاد نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مختلف خصوصیات کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر خصوصیت (صفت) کا ظہور اس کے مناسب موقعہ پر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے لئے نہات سخت گیر ہے اور مظلوم کے لئے رحیم و کریم۔ وہ قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والے کو سرفرازی اور سربلندی عطا کرتا ہے اور ان سے سرکشی برتنے والے کی نخوت وتکبر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوال ان صفات ہی کا نہیں، اس کے ساتھ سوال یہ بھی ہے کہ کس موقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ بات قرآنِ کریم کے گہرے مطالعہ سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

ہمارے ہاں جب مومنین کی خصوصیات کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے لئے عام طور پر چند اخلاقی خوبیاں گنا دی جاتی ہیں (مثلاً) وہ جھوٹ نہیں بولتے، بددیانتی نہیں کرتے وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے۔ مومنین ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن جس باب میں مومنؔ دوسرے ''نیک لوگوں'' سے منفرد ہوتے ہیں وہ اور ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ خارجی دنیا میں ظہور میں آئے تو اس وقت جس صفت خداوندی کو ظہور میں آنا ہو، مومن کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو یعنی ہر واقعہ پر اس کا ردِّعمل وہی ہو جو اس کے خدا کا ''ردِّعمل'' ہو۔ گرفت کے موقعہ پر گرفت۔ رحم کے موقعہ پر رحم۔ سرسام زدگان کی فصد کھولنے کے لئے نوکِ نشتر اور زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا پھاہا۔

اس تمہید سے یہ حقیقت سامنے آ گئی ہوگی کہ قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کی صفات اور مختلف مواقع پر ان کے ظہور کی جو تفاصیل بیان کی ہیں وہ حدودِ بشریت کے اندر درحقیقت مومن کی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود یہ بتانا ہے کہ ایک انسان کس طرح مومنؔ بنتا ہے اور مومن کی زندگی سے کس کس قسم کی خصوصیات کی نمود ہوتی ہے۔ میں نے ''نمود'' کا لفظ ارادۃً استعمال کیا ہے۔ بتانا اس سے یہ مقصود ہے کہ ایک مومن (مثلاً) جب عدل کرتا ہے تو وہ محنت و کاوش سے (WITH EFFORT) ایسا نہیں کرتا۔ عدل اس کی ذات

کی خصوصیت ہے جو مناسب موقعہ پر خود بخود نمودار ہو جاتی ہے۔ جس طرح روشنی اور حرارت سورج کی ذاتی خصوصیت ہے جس کا انعکاس خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مومن جس وقت سخت گیر ہوتا ہے اس وقت اس میں رحیمی اور کریمی کی صفت موجود نہیں ہوتی۔ مومن کی ذات میں یہ تمام صفات ہر وقت موجود رہتی ہیں اور مناسب مواقع پر خود بخود ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یوں کہئے کہ مومن مختلف صفات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی ذات ہمہ گیر ہوتی ہے جس میں یہ تمام صفات یوں سموئی سموئی ہوتی ہیں جس طرح پھول میں خوشبو، رنگینی، لطافت، نزاکت اور طبی خواص۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے قرآنِ مجید در حقیقت مومنین کی اپنی صفات و محاسن کا تذکرۂ جمیلہ ہے اِس کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [21:10] ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ اس حقیقت کو عقل و بصیرت کی رو سے سمجھو۔ دیکھئے اس عظیم حقیقت کو اقبالؒ کس حسین انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اور جس طرح قرآنِ کریم مختلف طرق و اسالیب سے مومنین کی خصوصیاتِ کبریٰ کا تذکرہ کرتا ہے اسی طرح اقبالؒ بھی گوناگوں انداز سے مومن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم نظام سے مقصد افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشو و نما ہی ہے یا یہ نظامِ کائنات کے خدائی پروگرام میں بھی کوئی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ حقیقت خدائی پروگرام کی تکمیل کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ وہ ان افراد (مومنین) کو حزب اللہ (5:56) کہہ کر پکارتا ہے یعنی خدا کی پارٹی۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے ان دو لفظوں میں اپنے مخصوص معجزانہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسانی دنیا میں خدا نے جس قدر ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ خدا کی اس پارٹی (جماعت مومنین) کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں اس جماعت کی اپنی مملکت قائم ہوئی لیکن مکہ میں ابھی

ایسے مسلمان تھے جو گھر کر رہ گئے تھے اور مخالفین انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی انتہائی مظلومیت کی حالت میں خدا کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ ان ستم زدگان کی براہِ راست مدد کر کے انہیں وہاں سے نکال لیتا۔ لیکن اس نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی پارٹی (یعنی مدینہ کے مسلمانوں) سے کہا کہ

(اے ہماری پارٹی کے لوگو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ظالمینِ مکہ کے خلاف جنگ کے لئے نہیں نکلتے؟ تم سنتے نہیں کہ وہاں کے مظلوم، مرد، عورتیں، بچے کس طرح بلک بلک کر ہمیں پکار رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے بحفاظت نکال لینے کا سامان پیدا کر دے۔ تو ہمارے لئے کوئی مددگار بھیج۔ تو کسی کو ہمارا پشت پناہ بنا۔ (4:75)

آپ نے غور فرمایا کہ وہ لوگ خدا کو مدد کے لئے پکار رہے تھے اور خدا ''حزب اللہ'' یعنی اپنی پارٹی سے کہہ رہا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ لوگ ہمیں کس طرح پکار رہے ہیں۔ تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے! یہ ان کی مدد کے لئے اٹھے اور ان کے دشمنوں کو میدانِ جنگ میں فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے بعد میں کہا کہ **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** [8:17] وہاں ان مخالفین کو تم قتل نہیں کر رہے تھے، ہم قتل کر رہے تھے۔ **وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** [8:17] تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ اور یہ اس لئے تھا **وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا** [9:40] کہ مخالفین حق وصداقت کے پروگرام کو شکست ہو اور خدا کا پروگرام غالب آئے اور اس کے لئے کہا کہ **اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ** [47:7] اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا کہ درحقیقت خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ تگ وتاز ہوتے ہو۔

یہ ہے عزیزانِ من! جماعت مومنین کا مقام اور یہ ہے وہ دلکش وبصیرت افروز انداز جس سے

خدا ان کا تذکرہ کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بار بار کہا ہے کہ ان کا پیغام' قرآن کے پیغام ہی کی تشریح و تبیین ہے' اس لئے ان کا کلام' بنیادی طور پر' مردِ مومن کی خصوصیات' مقام' فریضۂ حیات اور مطمحِ زندگی کا تابندہ و درخشندہ آئینہ ہے۔ آیئے اس آئینہ میں مردِ مومن کی چند ایک جھلکیاں دیکھیں۔

بندۂ مولا صفات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کی ذات میں' صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ بشریت جھلمل جھلمل کر رہی ہوں اور کائنات کے خدائی پروگرام اس کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچیں۔ دیکھئے حضرت علامہ ان حقائق کو اپنی نظم مسجد قرطبہ میں کس وجد آفریں انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں' کارکشا' کارساز
خاکی و نوری نہاد' بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دِل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب' اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو' گرم دمِ جستجو! — رزم ہو یا بزم ہو' پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق' مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام' وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں' گرمی محفل ہے وہ

آپ اس مصرعہ میں ''عقل کی منزل'' اور ''عشق کا حاصل'' کی اصطلاحات پر غور فرمایئے اور پھر قرآنِ کریم کی اس آیہ جلیلہ کو سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [3:190-191]

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ عقل وبصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں اُن صاحبانِ علم وبصیرت کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔

لہٰذا، مردِ مومن، علم وایقان، فکر وایمان، عقل وعشق، خبر ونظر کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی ذات متضاد صفات کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں سے ہر صفت اپنے اپنے وقت پر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور یوں دنیا اس طلسم کدۂ رنگارنگ (KALEIDOSOCOPE) کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی اور وجد وکیف کے عالم میں بیساختہ پکار اٹھتی ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری وقدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

اللہ کی برہان

ان ابیات میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ مومن کے متعلق کہا گیا ہے کہ گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان۔ تو اس سے مراد کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کے جوہرِ تخلیق کی زندہ شہادت ہوتی ہے۔ مونالیزا کے سحر آفریں تبسم کا خدنگِ بے کماں، لیونارڈو کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل اور شہادت ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق میں سے انسان کے متعلق کہا ہے کہ اُسے حسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی حسین ترین ہیئتِ ترکیبی لئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ہیئتِ ترکیبی سے مراد انسانی جسم کی رعنائی اور زیبائی نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہے۔ **ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ**

سٰفِلِیۡنَ ○ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ [95:5-6] انسان کے اندر حسین ترین مخلوق ہونے کے ممکنات پوشیدہ ہیں۔لیکن چونکہ اسے اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان ممکنات کو جس قالب میں چاہے ڈھال لے' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بے باک جذبات کی رَو میں بہہ کر پست ترین درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔لیکن جو لوگ اپنی ذات کے ارتقائی مدارج پر یقین رکھتے ہوئے خدا کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں وہ پستی کے گڑھے میں گرنے کے بجائے انسانی ہیئت کے بلند ترین اور حسین ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔انہی کو مومن کہا جاتا ہے۔لہٰذا مومن کی ہر نقل و حرکت خدا کے احسن الخالقین ہونے کی شہادت ہوتی ہے۔اس کے کردار کو دیکھ کر ہر شخص بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ جس ہستی کا تخلیقی شاہکار ایسا ہے اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔اس لئے مومن......گفتار میں، کردار میں' اللہ کی برہان بن جاتا ہے۔

تقدیرِ یزداں

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے۔یہ بھی ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی نے یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں معاملہ میں خدا کی مشیت' اس کا ارادہ کیا ہے۔وہ کیا کرنا چاہتا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس باب میں مردِ مومن کا فیصلہ اور ارادہ کیا ہے۔اس موقعہ پر جو فیصلہ مردِ مومن کا ہو' سمجھ لیجئے کہ وہی خدا کی مشیت ہے۔خدا ایسا ہی کرنا چاہتا ہے۔اس لئے کہ مومنین کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ [76:30] وہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ان کی مشیت' مشیتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے اور ان کا چاہنا خود خدا کا چاہنا۔اس حقیقت کو حضرت علامہ نے اپنے شعر میں باندازِ نو بیان کیا ہے جسے دہرایا تو اکثر جاتا ہے لیکن سمجھا بہت کم۔یعنی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی بلندی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات' صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار بن جائے۔

جب ایسا ہو جائے تو پھر مومن کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ اس کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا فیصلہ ہو۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

اس طرح مومن کے ارادے اور فیصلے' خدا کے مقاصد کے پہچاننے اور ماپنے کا مقیاس بن جاتے ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بدؔر کے میدان میں جماعت مومنین کی مقاتلانہ تگ وتاز کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ تم تلواریں نہیں مار رہے تھے' ہم مار رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے ہم چلا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی مرضی تمہارے ہاتھوں سے پوری ہو رہی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ جاویؔد نامہ میں کہتے ہیں:۔

عزمِ اُو خلاقِ تقدیر حق است
روزِ ہیجا؟ تیر اوُ تیر حق است

یہ اندازِ گفتگو فلسفیانہ سا ہے۔ اس کو ذرا شوخ انداز میں یوں کہتے ہیں کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

تقدیر کے ہاتھوں رونے والے مسلمان کو وہ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں کہ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جب مومنؔ اس طرح خود ''تقدیرِ یزداں'' بن جاتا ہے تو پھر وہ زمانے کی تقدیروں کو بدل دیتا ہے۔ تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اقوامِ عالم کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ رنگِ کائنات تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ کچھ بن جاتا ہے۔ مردِ مومن' جب اپنے ارادوں کو خدا کے ارادوں کے تابع کر دیتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ ہے مطلب حضرت علامہ کے یہ کہنے کا کہ......قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے...... یہ تو رہا اس دنیا کا معاملہ۔ اور اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ اس کے اعمال اسے جنت کا مستحق بنا دیں گے یا نہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مومن کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر دیکھ لے کہ اس کے اعمال اس پیمانے پر پورے اُترے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ

دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

عقل و جذبات

اب آگے بڑھیئے۔ عقل اور جذبات کو دو متضاد عناصر خیال کیا جاتا ہے جن میں ہمیشہ باہمی کشمکش رہتی ہے اور جب جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں تو انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ رہبانیت (یعنی تصوف) میں اس کا علاج یہ بتایا جاتا ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ بظاہر یہ بات کچھ نا قابلِ قبول سی نظر آئے گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصوف کا یہ مسلک خود شدتِ جذبات کا پیدا کردہ ہے۔ جذبات کو اس قدر قابل نفرت سمجھنا کہ انہیں فنا کر دینا ہی مقصودِ حیات قرار دے لیا جائے عقل کا فیصلہ قرار نہیں پا سکتا۔ عقل اسے بخوبی جانتی ہے کہ اگر انسان میں جذبات نہ ہوں تو اس کا (عقل کا) کوئی فیصلہ بروئے کار آ ہی نہ سکے۔ عقل کے فیصلے، عملی پیکر اختیار ہی جذبات کی قوت سے کرتے ہیں۔ لہٰذا، عقل کا کب یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے کارآمد عنصر کو اپنے ہاتھوں فنا کر کے خود عضو معطل بن کر رہ جائے۔ ترکِ جذبات کے معنی ہیں ترکِ آرزو، ترکِ مقاصد اور یہ خالص جذباتی چیز ہے اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی قابل غور ہے۔ انسانی جذبات بھی اسی خدا کے پیدا کردہ ہیں جس خدا نے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ لہٰذا خدا کی پیدا کردہ اتنی بڑی خصوصیت اور صلاحیت کو شر، فلہٰذا، قابل نفرت اور لائقِ ترک قرار دینا خدا کے عظیم تخلیقی پروگرام کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا سے جنگ کرنا خدا کے مقربین کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور آخری بات

یہ کہ جذبات ایسی قوت نہیں جسے آپ فنا کر سکیں۔ اُنہیں آپ وقتی طور پر دبا تو سکتے ہیں' فنا نہیں کر سکتے۔ اور دبانے کی صورت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان کا ایک راستہ بند کرتے ہیں تو وہ اپنے لئے دس اور راستے تراش لیتے ہیں ۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے بدنہادی یا (PERVERSION) کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جذبات کو قابل نفرت فلھٰذا' فنا کر دینے کے لائق قرار نہیں دیا۔ وہ انہیں بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کا اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح عقل کا۔ لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ انسانی جذبات کو سرکش اور بے باک نہیں ہونے دینا چاہئے۔ انہیں ہمیشہ...... ہدایت ...... یعنی اقدارِ خداوندی...... کے تابع رکھنا چاہئے۔ جب جذبات آسمانی ہدایت کے تابع رہیں گے تو ان کا نتیجہ تعمیر ہی تعمیر ہوگا۔ لیکن جب یہ اس سے سرکشی اختیار کر جائیں گے تو اس سے تباہی و بربادی' تخریب اور فساد پیدا ہوگا۔ اس کا ارشاد ہے کہ **وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيۡرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ** [28:50] ''اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہوسکتا ہے جو ہدایت خداوندی سے بے نیاز ہو کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے''۔ مومن میں عقل اور جذبات دونوں اپنی انتہائی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان دونوں کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں اس نظم کو سامنے لایئے جو ضربِ کلیم میں مدنیتِ اسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری — نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اسکی — یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت' عرب کا سوزِ دروں!

اس سرتاپا مرصع نظم کا ایک ایک شعر قرآن کی روشنی میں توضیح وتشریح کا متقاضی ہے۔ لیکن نقطہ زیرِ نظر کی رعایت سے ہم سرِدست اس کے مطلع تک محدود رہتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مومن کی

زندگی...... یہ ہے نہایتِ اندیشہ وکمالِ جنون......یعنی عقل جو اپنے انتہائے کمال تک پہنچی ہوئی ہو اور جذبات کی ایسی شدت جو سطح بیں لوگوں کی نگاہ میں دیوانگی نظر آئے۔ قرآنِ کریم نے عقل وجذبات کے اسی امتزاج کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ [3:159] اے رسولؐ! تم مہماتِ امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے بعد جب تم فیصلہ پر پہنچ جاؤ اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کا عزم کرلو، تو پھر قوانین خداوندی کی محکمیت پر یقین کامل رکھ کر میدان میں نکل آؤ۔ اور تمام خطرات سے بیگانہ ہو کر جانب منزل بڑھتے چلے جاؤ...... یقیناً فتح ونصرت تمہارے قدم چومے گی۔

ظاہر ہے کہ مشورہ، نہایتِ اندیشہ، کمالِ عقل وفکر کا نام ہے جس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر مشورہ میں جذبات دخل انداز ہو جائیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا، وحی خداوندی کی روشنی میں عقل وبصیرت کی رُو سے، پیش نظر معاملہ کا باہمی مشاورت سے فیصلہ کرو۔ اب اگلا قدم اس فیصلہ کو بروئے کار لانا ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط عزمِ راسخ ہے اور دوسری چیز اپنے فیصلہ کے مبنی برحق ہونے پر یقینِ کامل۔ ان کا تعلق جذبات سے ہے۔ اُن مومنانہ جذبات سے جن کے حاملین کے متعلق کہا کہ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ [3:173] وہ لوگ کہ جب ان سے دوسروں نے کہا کہ تمہارے مخالفین نے ہمارے خلاف ایک لشکر جرار جمع کر رکھا ہے۔ اس لئے ان سے ڈرو اور آگے نہ بڑھو۔ تو اس سے، بجائے اس کے کہ وہ خائف ہوں، ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کی پروا کیا ہے۔ ہمارا بھروسہ قوانین خداوندی کی محکمیت پر ہے اور یہ اتنی بڑی قوت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کرسکتی۔ یہ ہے مردانِ مومن کا عزم وتوکل جس کی رُو سے وہ دیوانہ وار آتشِ نمرود میں کود جاتے اور مخالفت کی ہر قوت پر غالب آجاتے ہیں۔ دیکھئے اقبالؒ اس حقیقت کو کیسے بصیرت افروز انداز میں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اُمتاں را زندگی جذبِ دروں   کم نظر ایں جذب را گوید جنوں

ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد   بے جنونِ ذوفنون کارے نکرد!

مومن از عزم و توکل قاہر است

گرندارد ایں دو جوہر کافراست

لیکن جذبات کی اس قدر اہمیت کے باوجود مومن کی زندگی میں یہ کس طرح اقدارِ خداوندی کے تابع رہتے ہیں۔ اسے قرآنِ کریم نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ **قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ** [9:24] اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے بیٹیاں، بھائی برادر، تمہاری بیویاں یا دیگر رشتہ دار **وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا** تمہارا مال و دولت جسے تم نے محنت شاقہ سے حاصل کیا ہے **وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا** تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو۔ **وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ** اور تمہارے یہ محلات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی کشش و جاذبیت **اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ** تمہارے نزدیک، خدا، رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔ **فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ** [9:24] تا آنکہ قانونِ خداوندی اپنا فیصلہ صادر کر دے اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ...... یہ ہے قرآن کی رُو سے اقدارِ خداوندی سے ٹکراؤ کی صورت میں انسانی جذبات کی حیثیت۔ اس قسم کے تصادم کے وقت مومن جذبات کا دامن جھٹک کر، اقدارِ خداوندی کے تحفظ کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ مومن تمام معاملات کے فیصلے، ہدایت خداوندی کی روشنی میں عقل و فکر اور غور و تدبر کی رُو سے کرتا ہے۔ اور جب کسی معاملہ میں فیصلہ کر کے اسے بروئے کار لانے کا عزم کر لیتا ہے تو پھر وقتی مصلحت کوشیوں سے بے نیاز ہو کر راستے کی تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے جب کہا ہے کہ

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم

لیکن یہی جذبات جب اس کی راہ کے کانٹے بنتے نظر آئیں تو وہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

عملِ تخلیق

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ خدا کی ایک صفت **فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ہے یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ یہ صفت خدا کے لئے مختص ہے اور انسانی ذات، خواہ وہ کتنی ہی نشو و نما یافتہ کیوں نہ ہو جائے، اس صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔

حیوانی سطح پر افزائش نسل کا ذریعہ تولید ہے۔ یعنی جنسی اختلاط۔ خدا اس سے بلند و برتر ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ **لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ** [3:112] اس کی ذات افزائش کے طریق تولید سے بلند و بالاتر ہے۔ لیکن انسانی نسل کی افزائش، طریقِ تولید کی رُو سے ہوتی ہے اس اعتبار سے حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

لیکن پیدائش کا ایک اور طریق ہے جسے عملِ تخلیق کہا جاتا ہے۔ تخلیق کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ جو عناصر موجود ہیں ان میں مختلف تراکیب سے امتزاج کے ذریعے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ خدا نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے علاوہ اور خالق ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کا عملِ تخلیق، خدا کے تخلیقی نوادر جیسا حسین نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا احسن الخالقین ہے۔ اس سے تین نکات ہمارے سامنے آئے۔ (1) فاطر صرف خدا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ (2) عملِ تولید حیوانی سطح پر طریقِ افزائش ہے اور (3) مومن عملِ تخلیق میں خدا کا رفیق ہوتا ہے۔ تولید میں صرف تکرار ہوتی ہے۔ اس کی رُو سے ہر حیوان، جس میں انسان بھی شامل ہے، صرف اپنے جیسا بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں ندرت نہیں ہوتی۔ ارتقاء نہیں ہوتا۔ فکر کی دنیا میں اسے تقلید کہتے ہیں یعنی جو ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح ہوتا چلا جائے۔ تخلیق کے لئے نئی فکر، نئے خیال، نئی آرزو، نئے

نئے مقاصد کا دل میں اُبھرنا، نئی نئی تمناؤں کا بیدار ہونا، شرطِ اوّلیں ہے۔ آپ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے جب تک آپ کے دل میں اس کے لئے ایک نیا خیال نہ اُبھرے۔ مومنؔ کی زندگی تخلیقی کارناموں کا مظہر ہوتی ہے۔ تقلید و تکرار اس کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے پیغام کا نقطہ ماسکہ تخلیقِ مقاصد اور بیداریٔ آرزو ہے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف ''اسرارِ خودی'' کے ابتدائی باب میں کہتے ہیں کہ

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

اور

ما زِ تخلیق مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

عملِ تخلیق کے لئے زندگی کے بلند مقاصد پر یقین ضروری شرط ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:۔

بے یقیں را لذتِ تحقیق نیست
بے یقیں را لذتِ تخلیق نیست

اقبالؒ کے نزدیک ایمانؔ کا فطری نتیجہ، تخلیقِ مقاصد ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ

ہر کہ اورا لذتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مومنؔ کارگہِ کائنات میں اپنے عملِ تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو اقبالؒ مردِ حُر یا بندۂ آزاد کہتا ہے۔ اس کے برعکس غلامؔ ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

کیشِ اُو تقلید و کارش آذری ست
ندرت اندر مذہبِ اُو کافری ست
تازگی ہا وہم و شک افزائدش
کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

حضرت علامہ فکر کی تازگی کی اہمیت کے متعلق کہتے ہیں کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس کی تشریح (بالِ جبریل میں) ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ:۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب　　ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی　　ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا، لعلِ ناب

خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق کہا تھا کہ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ [35:1] وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق کائنات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ مومنؔ بھی ندرتِ فکر و عمل سے نئی نئی ایجادات سے، خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ پولینڈ کا مفکر، باردیوؔ اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ ’’امرِ تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا بھی انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے‘‘۔

(THE DIVINE AND THE HUMAN)

نسل و رنگ

اب تولید و تخلیق کے فرق کا اگلا مرحلہ دیکھئے:۔

جہاں تک انسان کی تمدنی زندگی کا تعلق ہے، تولیدؔ کی حیوانی سطح پر، افراد کا باہمی رشتہ خون اور نسل کے اشتراک کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک خاص نسل کے گھوڑے، خاص نسل کے بیل، خاص نسل کی بھیڑیں، الگ الگ نوع قرار پاتی ہیں۔ ان میں نسلی اشتراک کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ جب انسان بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے تو وہ بھی خون اور نسل کے اشتراک سے مختلف قبیلوں اور قوموں میں بٹ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ مومنؔ کی سطح پر آ جائے تو پھر ان میں وجہ جامعیت خون اور نسل کا اشتراک نہیں رہتی۔ اقدار کا اشتراک وجہ جامعیت یا معیارِ قومیت قرار پاتا ہے۔ اس کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کریں، ایک قوم کے افراد اور جو لوگ مومنانہ سطح پر زندگی بسر کریں، دوسری قوم کے اراکین۔ ماں، باپ، زن و فرزند، اعزا و اقارب سے

تعلقات، معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر اس تقاضا اور اقدارِ خداوندی میں ٹکراؤ۔ ہو تو یہ تعلقات یا یوں کہئے کہ خون اور نسل کا اشتراک، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مومن ان رشتوں کو بلا تامل توڑ کر، ان لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ [9:23] اے جماعت مومنین! اگر تمہارے ماں باپ یا بھائی بند، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کرتے ہوں تو تم ان سے دوستداری کے تعلقات مت وابستہ رکھو۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ [9:23] یاد رکھو! جو ایسا نہیں کرے گا اور ان سے بدستور دوستانہ تعلقات وابستہ رکھے گا تو اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہو گا۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

قومِ تو از رنگ و خوں بالا تر است — قیمتِ یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزوِ ملت کردۂ — رخنہ در کارِ اخوت کردۂ

(بے خودی)

یعنی

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

میں چونکہ اس موضوع پر سالہا سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آ رہا ہوں اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان اشارات سے آپ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہو گا کہ اسلام میں قومیت کا مسئلہ سیاسی یا تمدنی سوال نہیں۔ یہ کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا انسانی سطح پر...... حیوانی سطحِ زندگی کو کفر کہا جاتا ہے اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی سطحِ زندگی کو ایمان۔ قرآن کے عباد اللہ اور اقبالؒ کے مردانِ مومن کا ایک امتیازی جوہر یہ بھی ہے کہ وہ خون اور نسل کے حیوانی رشتہ کے بجائے ایمان و اقدار کے انسانی (مومنانہ) رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

رحم اور قوت

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ دنیا میں رحمؔ اور قوتؔ دو ایسے عناصر ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔ عیسائیت نے خدا کو سرتا سر رحمؔ قرار دیا ہے اور قوت کے ہر قسم کے تصور کو شرؔ سے تعبیر کیا۔ خدا کے اس تصور نے جس قسم کا ضابطہ اخلاق مرتب کیا' اس کے نتائج وعواقب کے متعلق عصر حاضر کا ایک عظیم مفکر ''وسائٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:۔

> اس ضابطہ کو اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔
>
> (ADVENTURES OF IDEAS)

اس تصور کے خلاف ردِّعمل کا انتہائی مظہر جرمن فلاسفر نیٹشے ہے جس کے نزدیک ''زندگی کا راز'' قوت اور بے پناہ قوت میں ہے۔ وہ اس خصوصیت کے سوا کسی قدر کا قائل ہی نہیں۔ اس تصورِ حیات نے کیا نتائج پیدا کئے' اس کی زندہ شہادت وہ جہنم ہے جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات باطل اور غلط نگہی پر مبنی ہیں۔ خدا **ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ** [51:58] یعنی بے انتہا محکم قوتوں کا مالک بھی ہے اور **اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ** [7:15] بھی۔ یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ وہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے صاحب قوت ہے اور مظلوم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے انتہائی شفقت ورحمت کا مظہر۔ عبد مومن خدا کی ان دونوں صفات کا حامل ہوتا ہے اور اقبالؒ نے ان صفات کے حسین وجمیل امتزاج کو مختلف اسالیب وانداز سے اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ اگر میں اس کی تفصیل میں جانا چاہوں تو اس کے لئے کئی نشستیں درکار ہوں گی۔ قرآن نے جماعت مومنین اور ان کے سربراہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے کہ **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ** خدا کے پیغامبر محمدؐ اور ان کے رفقاء کی کیفیت یہ ہے کہ **اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ** [48:29] وہ حق وصداقت کے

مخالفین کے لئے چٹان کی طرح سخت ہیں اور باہمد گر، حریر و اطلس کی طرح نرم۔ اقبالؒ ان متضاد خصوصیات اور ان کے امتزاج کو انتہائی وجد کیف کے عالم میں بیان کرتا چلا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضربِ کلیم کی وہ تابندہ نظم جس کا مطلع ہے...... ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن......اور جس کے چند اشعار میں اس سے پہلے پیش خدمت کر چکا ہوں۔ اس کے آخر میں کہا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بانگ درا کی مشہور نظم......طلوعِ اسلام......میں وہ، مسلمان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ:۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

قیام و سجود

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ [48:29] اس کے بعد قرآنِ کریم نے فدائیوں کی اس جماعت کی خصوصیت یہ بتائی کہ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا [48:29] توانہیں دیکھے گا کہ کبھی رکوع میں جھکے ہوئے کبھی سجدہ میں گرے ہوئے۔ علامہ اقبالؒ مومن کی صلوٰۃ سے کئی نادر معانی اخذ کرتے ہیں۔ وہ کبھی کہتے ہیں کہ

بسوزد مومن از سوزِ وجودش کشودِ ہر چہ بستند از کشودش
جلالِ کبریائی در قیامش جمالِ بندگی اندر سجودش

عبد مومن کے قیام و سجود کے جلال و جمال کے حسین منظر سے، میرے افقِ ذہنی پر، بلا ساختہ افغانستان کی ایک شاعرہ پری بدخشنی کی غزل کا ایک شعر نمودار ہو گیا۔ اس نے کہا ہے اور دیکھئے کس ساحرانہ انداز میں کہا ہے کہ

برخاستی! قیامتِ کبریٰ بلند شد
بنشیں دمے! کہ فتنۂ محشر نشستہ بہ

لیکن اقبالؒ کسی اور ہی مقام سے بات کرتا ہے۔ ارمغانِ حجاز کا ایک قطعہ آپ نے بھی ابھی سن لیا۔ اسی مضمون کا دوسرا قطعہ ہے کہ

دو گیتی راصلا از قراتِ اوست   مسلماں لا یموت از رکعتِ اوست
نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز   قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست

مومن کا قیام و سجود آئینہ دار ہے اس حقیقت کا کہ وہ ایک خدا کے حضور جُھک کر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے مردانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے۔ سجدہ، اگر بغیر قیام کے ہو تو وہ عیسائیت (بلکہ یوں کہئے کہ) مسلکِ رہبانیت کے ''خدا'' کا خود ساختہ تصور ہے۔ اور اگر قیام بلا سجدہ ہو تو وہ نیٹشے کے تصور کا (SUPERMAN) ہے جو اندھی قوت کا قہرمانی مجسمہ ہوتا ہے۔ قرآن نے قوت اور اقدارِ خداوندی کے امتزاج کو نہایت بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ [57:25] ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت اور میزانِ عدل دے کر بھیجا تا کہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن اس مقصد کے لئے نظری تعلیم یا پند و نصائح کافی نہیں تھے۔ اس لئے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ہم نے ان کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی نازل کی۔ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ [57:25] اگر اسے خدا کے نازل کردہ ضابطہ ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ضابطہ خداوندی اور اس کے ساتھ تلوار (یعنی

مادّی قوت)۔ یہ ہے اسلام۔ تلوار کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے　　کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں　　پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

تنہا تلوار، بیت زندگی کا صرف ایک مصرع ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس کے ساتھ دوسرا مصرع نہ ہو، یہ شعر نہیں بن سکتا۔ وہ دوسرا مصرعہ اقتدارِ خداوندی کا ضابطہ ہے۔ اقبالؒ نے اپنی زندہ و پائندہ تصنیف، جاوید نامہ میں تلوار اور قرآن کے باہمی تعلق کو ایسے عمیق لیکن درخشندہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں چشمِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آ جاتا ہے (مغلیہ خاندان کے) شاہ عالم کے زمانہ میں، پنجاب کے گورنر، نواب خان بہادر خان کی صاحبزادی محترمہ شرف النسا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ کمر سے تلوار باندھے رکھتی تھیں اور ہاتھ میں قرآن۔ اور انہوں نے اپنی والدہ کو وصیت کی تھی کہ اس کی وفات کے بعد یہ دونوں چیزیں اس کی قبر کے اوپر رکھ دی جائیں۔

اقبالؒ اپنے آسمانی سفر میں، جنت الفردوس میں اس شہزادی والا تبار سے ملتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کے ان شعارِ زندگی اور آخری وصیت کی حکمت کیا تھی۔ وہ جواب میں کہتی ہیں کہ میں تلوار اور قرآن کو اس لئے ساتھ رکھتی تھی کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگراند　　کائناتِ زندگی را محور اند!
مومناں را تیغ با قرآن بس است　　تربتِ مارا ہمیں ساماں بس است

تلوار سے مراد، عسکری قوت ہی نہیں بلکہ ہر قسم کا اقتدار ہے۔ جب دین بلا اقتدار کے ہو تو وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا منتہیٰ وعظ و نصیحت کی منت خوشامد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب اقتدار ضابطہ خداوندی سے الگ ہو جائے تو وہ ہر دَور میں فرعونیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی اس جلال آفریں نظم کو پڑھیئے اور دیکھئے کہ حکیم الامت نے اس حقیقت کو کیسے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل ونظر وعلم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہوتو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

واضح تر الفاظ میں کہ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مومن کی سیاست دین کے تابع رہتی ہے۔قرآن اس کی تلوار کا محافظ ہوتا ہے کہ وہ بے راہ رَو نہ ہونے پائے اورتلوارقرآن کی محافظ کہ وہ مذہب بن کر نہ رہ جائے۔اس طرح مومن کی تلوار اس کی قوت‘ اس کا اقتدار‘اس کی سیاست‘ اس کی مملکت‘ دنیا میں مقاصد خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب مکہ کے مظلوموں نے اپنی امداد کے لئے خدا سے فریاد کی تو اس نے کس طرح مدینہ کے صاحب اقتدار مسلمانوں سے کہا کہ تم ان مظلوموں کی فریاد کو سنتے نہیں! تم اُن کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے ؟ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

اللہ کو پا مردئ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

مومن کوخدا کے قانونِ مکافات کی محکمیت پر بھروسہ ہوتا ہےاور خدا کو جماعت مومنین کی استقامت اور پامردی پر بھروسہ کہ جب یہ مشیتِ خداوندی کے بروئے کار لانے کے لئے اٹھتے ہیں‘ تو اس کی (مشیت) بروئے کار آ کر رہتی ہے۔اس لئے کہ اِور سن رکھو کہ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ یہ خدا کی پارٹی ہے اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [58:22] اور سن رکھو کہ خدا کی پارٹی کامیاب ہوکر رہتی ہے۔ صرف کامیاب ہی نہیں فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ [5:56] یہ سب پر غالب آ کر رہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔کوئی قوم ان سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔آگے بڑھنا تو

ایک طرف کوئی قوم ان کے ہمدوش نہیں ہوسکتی۔ ان کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ [3:139] جب تم مومن ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی نہیں ہوسکتا۔ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا [4:141] یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنوں پر غالب آ جائیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر واضح ہے کہ دنیا میں (خدا کی طرف سے) حقِ حکومت صرف جماعت مومنین کو حاصل ہوگا۔ کسی اور کو نہیں۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھال لیتا۔ وہ اس ماحول کو اپنے نظریات وتصورات کے مطابق ڈھلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اسی کا نام انقلاب ہے اور مومن دنیا میں سب سے بڑا انقلابی ہوتا ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں ہے کہ

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار ۔۔۔ بامزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد بامزاجِ او جہاں ۔۔۔ می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را ۔۔۔ می دہد ترکیب نوذرات را
گردشِ ایام را برہم زند ۔۔۔ چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار ۔۔۔ روزگارِ تو کہ باشد سازگار

اس قسم کا انقلاب، مردِ مومن کا ایمان ہی برپا کرسکتا ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ ۔۔۔ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار ۔۔۔ اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(MARTIN BUBAR) نے اس حقیقت کو جس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، جی نہیں چاہتا کہ اس کیف میں آپ کو شریک کئے بغیر آگے بڑھا جائے وہ کہتا ہے کہ

> جب قوتِ تخلیق ہم پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلا کر ہمارے اندر جذب ہو جاتی ہے اور اس آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہماری تخلیقِ نو کرتی ہے۔ ہم اس کے آتشیں جلال کے حضور میں پہلے کانپتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں۔ سربسجود ہو جاتے ہیں[1]۔ لیکن اس کے بعد ہم خود عملِ تخلیق میں شریک ہو جاتے ہیں اور خالق سے جا ملتے ہیں اس کے معاون اور رفیق کی حیثیت سے۔ (I AND THOU)

اس قسم کا جہانِ نو، مردِ مومن کی قوتِ بازو ہی سے وجود میں آ سکتا ہے۔ ایسا انقلاب کوئی اور پیدا نہیں کر سکتا جس میں کیفیت یہ ہو کہ **يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ** [14:48] یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے۔ **وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ** [14:48] اور ان میں ایک نئی دنیا اُبھرے جس میں صرف خدائے واحد کا سکہ رواں ہو۔ **وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا** [39:69] اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ ہیں وہ مردانِ حر جو ہیگل کے ''روحِ زمانہ'' اور مارکس کے ''تاریخی وجوب'' کے تابع مجبور و مقہور زندگی بسر کرنے کے بجائے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ باردیو کے الفاظ میں:۔

> یہی وہ انسان ہے جو تاریخ اور کائنات کی زندگی جیتا ہے اور اس میں باعمل و متحرک رہتا ہے لیکن تاریخ اور کائنات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنے ارادوں کے تابع ڈھال لیتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی ذات کی یا ان لوگوں کی ذمہ داری ہی نہیں لیتا جو اس کے گرد و پیش ہوں بلکہ تمام نوعِ انسان کے مقدمات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

(THE DIVINE AND HUMAN)

1۔ بوبر چونکہ یہودی ہے اس لئے اس کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ طور کی طرف ہے۔

قرآن کے الفاظ میں وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ [2:143]
اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تا کہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو۔

یہ ہے مومن کا مقام اِس دنیا میں اور چونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی' آگے بھی چلتی ہے' اس لئے جہانِ فردا میں بھی امامت کا سزاوار یہی ہوگا۔اس لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

بانگ درا میں ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور بالِ جبریلؑ کی یہ رقصندہ وسرایندہ غزل۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ وبو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان ومکاں اور بھی ہیں!

قرآنِ کریم کی رُو سے تو' جنت بھی مومن کے سفرِ حیات کی آخری منزل نہیں' راستے میں ستانے کا مقام ہے۔یعنی دم لے کر آگے چلنے کا مقام۔ کاروانِ حیات نے اس کے بعد بھی کئی ارتقائی منازل طے کرنی ہیں۔اسی لئے اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ان کی (پیشانی کا) نور ان کے آگے اور دائیں بائیں راستے روشن کرتا جائے گا۔ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا [66:8] اور ان کی پکار یہ ہوگی کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے' ہمارے نور کی تکمیل کر دے۔اس نورانی سفر کی آخری منزل کونسی ہوگی' اس کے متعلق کچھ نہیں

بتایا گیا۔ اس لئے کہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح پر یہ حقیقت ہمارے حیطہ ادراک میں آ نہیں سکتی تھی۔ اس کی سمت کا اشارہ کرتے ہوئے اتنا کہا گیا کہ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی [53:42] اس سفر کا منتہیٰ تیرے ربّ کی طرف ہے۔ یاد رہے کہ اہل تصوف کا جو نظریہ ہے کہ انسانی ذات' ذاتِ خداوندی کا ایک جزو ہے اور زندگی کی تمام تگ و تاز کا ماحصل یہ ہے کہ یہ جزو اپنی اصل یعنی ذاتِ خداوندی میں جا کر جذب اور فنا ہو جائے' یہ تصور قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا' خود اقبالؒ بھی اس نظریہ کے خلاف ہے۔ اس کی تلقین یہ ہے کہ

چناں باذاتِ حق خلوت گزینی — ترا اُو بیند و اُو را تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش — مشو ناپید اندر بحر نورش

(گلشنِ راز جدید)

یہ بہر حال' ایک الگ موضوع ہے جس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ مومن وہ ہے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کے مقامات کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر — زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ[1] ابدی — نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

(ارمغانِ حجاز)

☆ ...... ☆ ...... ☆

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا' قرآنِ کریم کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس میں مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں سے' مردانِ مومن کی خصوصیات کیفیات کا تذکرہ ہے اور علامہ اقبالؒ کا پیغام بھی چونکہ حقائقِ قرآنی ہی کا ترجمان ہے اس لئے اس

میں بھی مومنؔ کی صفات وتجلیات کو پہلو بدل بدل کر بیان کیا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر وہ پھول کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح فرداً فرداً سامنے آتی ہیں اور کہیں انہیں گلدستہ کی طرح جامع حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میں ایسے مقامات کی دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں تا کہ اقبالؒ کے مردِ مومن کی ایک جھلک بیک نظر آپ کے سامنے آجائے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف' مثنوی اسرار ورموز میں سورۂ اخلاص کی آیت وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رشتۂ با لم یکن باید قوی — تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است ولا شریک — بندہ اش ہم درنسازد باشریک
مومنے بالائے ہر بالا ترے — غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر — امر و نہیِ او عیارِ خیرو شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم — ہم بقہر اندر مزاجِ او کریم
سازِ اُو در بزمہا خاطر نواز — سوزِ اُو در رزمہا آہن گداز
زیرِ گردوں می نیاساید دلش — بر فلک گیرد قرار آب و گلش

میں یہ اشعار پڑھ رہا ہوں اور میرے حافظہ میں ایک ایسے واقعہ کی یاد تازہ ہو رہی ہے جو ہے تو ذاتی لیکن جی نہیں چاہتا کہ میں اسے یہاں بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ میرے ابتدائی تعلیم و تربیت' میرے لائقِ صد احترام' دادا جان (مرحوم ومغفور) کے زیر سایۂ عاطفت ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت علامہ کی یہ مثنوی مجھے خود پڑھائی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ انہوں نے جب اقبالؒ کے اشعار اور قرآن کی روشنی میں' مردِ مومن کی صفات وخصائص بیان کیں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں نے نہایت استعجاب اور کچھ خوف کے سے' ملے جلے جذبات کے ساتھ ان سے کہا کہ بابا جان! مردِ مومن اگر ایسا ہوتا ہے تو مجھے تو آج ساری دنیا میں کوئی مردِ مومن نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آج مردِ مومن کہیں نظر نہیں آتا لیکن غنیمت ہے کہ اگر ہمارے دَور میں کوئی مومن نہیں تو دنیا میں

آج کوئی کافر بھی موجود نہیں۔ اگر صورت یہ ہوتی کہ ابوجہل تو ہوتا اور عمرؓ نہ ہوتا تو پھر البتہ گھبرانے کی بات تھی۔ دنیا آج کفر اور ایمان دونوں کی طرف سے بے اعتنا (INDIFFERENT) ہوتی جارہی ہے اور جو لوگ زندگی کے حقائق کی طرف سے (INDIFFERENT) ہو جائیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ تھا جو کچھ دادا جان (مرحوم) نے فرمایا۔ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد جب ضربِ کلیم سامنے آئی تو اس کے شروع میں ہی یہ شعر نظر پڑا۔

نہ دیر میں، نہ حرم میں، خودی کی بیداری ۔۔۔ کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روحِ تریا کی

تو میری سمجھ میں آیا کہ دادا جان نے اتنا عرصہ پہلے کیا بات کہی تھی۔

یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں کلامِ اقبالؒ سے مردِ مومن کی صفات وخصوصیات کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق اسکی محبت بھی عمیق ۔۔۔ قہر بھی اسکا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ۔۔۔ ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو ۔۔۔ شمع محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں ۔۔۔ بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا ۔۔۔ اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جب اقبالؒ کے کلام سے مردِ مومن کی خصوصیات میرے سامنے آئیں تو میں نے بصد تاسف کہا کہ دادا جان! مجھے اس بھری دنیا میں کوئی مومن نظر نہیں آتا۔ اب سوچئے کہ جب کلام اقبالؒ کے سامنے آنے سے میری یہ کیفیت ہوگئی تھی تو اس باب میں خود اقبالؒ کی کیفیت کیا ہوگی؟ اقبالؒ ساری عمر مردِ مومن کی تلاش کرتا رہا اور گلی گلی، کوچہ کوچہ، صحرا صحرا، دریا دریا پکارتا گیا کہ:۔

ورمعرکہ بے سوزِ تو، ذوقے نتواں یافت ۔۔۔ اے بندۂ مومن! تو کجائی؟ تو کجائی؟

اس کی ساری عمر اسی پکار میں گذر گئی۔ لیکن زندگی بھر کی طلب وجستجو کے باوجود جب اسے مردِ مومن

کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی تو وہ ہار تھک کر بیٹھ گیا اور انتہائی کرب والم کے ساتھ پکار اٹھا کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش　　مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام　　بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی　　یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ اس لئے کہ

منزل و مقصودِ قرآں دیگراست　　رسم و آئینِ مسلماں دیگراست

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

دین حق از کافری رسواتر است　　زانکہ ملا مومنِ کافر گراست

لہٰذا، مردانِ مومن کہاں سے آئیں؟

والسلام

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ کون سا دماغ ہے —

جس میں — اِس قسم سوالات نہیں اُبھرتے کہ:

- ○ کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوتی ہے؟ ○ کیا سب کچھ خدُا کی مرضی سے ہوتا ہے؟
- ○ کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عُمر دھکّے کھاتے رہیں؟ ○ کیا خدُا کو ایسا ہی منظور ہے؟
- ○ کیا موت کا ایک دن مقرر ہے یا وہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہے؟
- ○ بعض بچے پیدائشی اندھے، لُولے، لنگڑے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا یہ بھی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے؟
- ○ اگر خدُا کے ہاں عدل ہے تو وہ ظالموں کو ظلم سے کیوں نہیں روکتا؟
- ○ کیا دُعا سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ اگر نہیں بدلتی تو ہم دُعا کیوں کرتے ہیں؟

یہ، اور اِسی قسم کے دیگر سوالات کا تعلق **مسئلۂ تقدیر** سے ہے جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔

یہی وہ مسئلہ تھا جس کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے **کارل مارکس** نے کہہ دیا کہ:

مذہب عوام کے لیے افیون ہے

جنابِ **پرویز** نے — دُنیا کے اِس مُشکل ترین مسئلہ کو — اپنی تصنیف

کتاب التقدیر

میں قرآنِ کریم کی روشنی میں، اس عُمدگی سے حل کر دیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔

کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور عُمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ جلد مضبوط — اور گرد پوش جاذب نگاہ (نقشِ ثانی) ——— قیمت:

خُدا نے قرآنؐ نازل کیا تو ــــ

اس ذاتِ گرامیؐ کی حیاتِ طیبہ کے اہم گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا جس پر قرآن نازل کیا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ

حضورؐ کی سچی اور قابلِ اعتماد سیرت

(جسے نوعِ انسانی کے لیے بہترین نمونہ بننا ہے) وہی ہو سکتی ہے جس کی بنیاد اِن گوشوں پر ہو

مفکرِ قرآن نے اپنی عمر بھر کی کاوش کے بعد اس سیرتِ طیبہ کو اپنی مایہ ناز کتاب

معراجِ انسانیتؐ

میں مرتب کیا ہے

جس سے اُس ذاتِ اقدس کی عظمت اُبھر کر دُنیا کے سامنے آجاتی ہے

س کتاب کا پہلا ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مصنف کی نظرِ ثانی نے اسے جدید پیکر میں پیش کیا ہے

اس نئے ایڈیشن کی ضخامت تقریباً پانچسو صفحات ہے!

بڑا سائز، کاغذ نہایت اعلیٰ، جلد مضبوط، گرد پوش جاذبِ نگاہ

قیمت:

مرثیہ کیوں؟

آپ گھر میں ہوں یا دفتر میں، بازار میں ہوں یا دکان پر، ریل میں ہوں یا بس میں، تانگے میں ہوں یا ٹرام میں، بارات میں ہوں یا جنازے کے ساتھ — جہاں کہیں دو مسلمان جمع ہوں مسلمانوں کی عام حالت کے مرثیہ خواں نظر آئیں گے۔ پہلے تو صرف اتنا ہی کہا جاتا تھا کہ قوم میں سخت افلاس ہے۔ لوگوں کے پاس کھانے کو روٹی پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان نہیں۔ بیمار پڑ جائیں تو دوائی نہیں اور مر جائیں تو کفن دفن تک کے لیے پیسے نہیں۔ اب اس کے ساتھ اس کا بھی اضافہ ہوتا ہے کہ لوگ بد دیانت ہیں، بے ایمان ہیں، چور ہیں، جھوٹے ہیں۔ بلیک مارکیٹ، رشوت، نفع خوری اعتو پڑی اور اقربا نوازی عام ہے۔ افراد سے آگے قوموں تک جائیے تو مسلمانوں کا ہر ملک تباہ حال ہے۔ عوام میں جہالت اور غربت ہے، خواص خائن اور غدار ہیں۔ یہ مرثیہ تو عام ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اس کی آخر وجہ کیا ہے

مسلمان کیوں ہر جگہ پستی اور ذلت میں ہیں؟

اگر آپ کو اس سوال سے دلچسپی ہے تو آپ وہ کتاب ضرور دیکھئے جس کا نام ہے

اسبابِ زوالِ امت

اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

قیمت : (تازہ ایڈیشن):

محترم پرویز صاحبؒ کا نہایت حقیقت کشا مقالہ

حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی عظمتِ کردار اور رعنائیٔ سیرت کی

چند جھلکیاں

جن کے بل بوتے پر انہوں نے بے تیغ و سناں جو جمہی لڑائی لڑ کر ایک عظیم مملکت حاصل کر لی

اِن کے ساتھ پرویز صاحب کے دو مقالات ——————

◁ کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

اور

◁ دو قومی نظریہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی نگاہوں میں۔

جن کی اہمیت عنوانات سے عیاں ہے۔

تینوں مقالات کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ بڑی پُر از معلومات کتاب ہے۔ بڑا سائز قیمت

علامہ اقبالؒ کا احسان

یہ ہے کہ اُنہوں نے صدیوں کے بعد، اسلام کا صحیح تصور ملت کے سامنے پیش کیا ــــ اور

پرویز صاحبؒ کا احسان

یہ ہے کہ اُنہوں نے اقبالؒ کے فکر اور پیغام کو، اس کے حقیقی سرچشمہ،

قرآن مجید کی روشنی میں،

قوم کو سمجھایا۔ ان کے چالیس سال پہ پھیلے ہوئے خطابات، تقاریر اور مقالات، اسی فریضہ کی ادائیگی کے مظہر ہیں۔ جنھیں اب ــــ

اِقبالؒ اور قرآن

کے حسین پیکر میں، بڑی آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے ــــ

اقبالؒ کی فکر ــــ قرآن کی روشنی ــــ پرویز صاحبؒ کی زبان

آپ خود سمجھ لیجئے کہ اس امتزاج کی کیفیت کیا ہوگی! قیمت:

اِسلام — مذہب نہیں

دِین ہے۔ یعنی نظامِ حیات جو ایک آزاد مملکت میں پروان چڑھتا ہے۔
اس نظام کی تشکیل کا آغاز عہدِ نبوی میں ہوا، لیکن وہ اپنے عہدِ شباب تک

خلافتِ فاروقیؓ

میں پہنچا۔ اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ حیات دیکھنے کے لیے اُس عہد کی صحیح تصویر کا
سامنے آنا ضروری ہے۔ اسے پرویز صاحب نے اپنی مدت العمر کی تحقیق و کاوش کے بعد، اپنی

عظیم تصنیف

شاہکارِ رسالتؐ

میں پیش کیا ہے۔ اس کے آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ

عہدِ فاروقیؓ کے بعد اسلام پر کیا گزری؟

اور وہ کس طرح دین سے موجودہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اس کتاب نے ہماری فکری دُنیا میں
انقلاب پیدا کر دیا ہے

بڑی ضخیم کتاب ہے ________ قیمت :

قرآنی پمفلٹس

صحیح قرآنی فکر کو عام لوگوں تک پہنچانے میں قرآنی فکر پر لکھے گئے چھوٹے پمفلٹس نے بھی بہت ہی اہم اور کامیاب کردار ادا کیا ہے۔ احباب اِن پمفلٹس کا خود بھی مطالعہ کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو تقسیم بھی کرتے ہیں اس لئے اِن کی قیمت اصل لاگت سے بہت ہی کم رکھی جاتی ہے۔ جبکہ کچھ صاحب ثروت احباب اِس کمی کو اپنے عطیات سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ یہ سلسلہ ابھی بھی محدود پیمانے پر جاری ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اِس سلسلہ کو مزید بہتر کیا جائے لہٰذا صاحب ثروت حضرات سے مزید عطیات کی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ قرآنی فکر کے کام میں مزید وسعت پیدا کرنے میں ہماری مدد کریں اور اپنے عطیات ''پمفلٹس فنڈ'' کے لئے بھجوائیں تاکہ پمفلٹس کی طباعت اور دوسروں تک قرآنی فکر کو پہنچانے میں ہم کامیابی حاصل کرسکیں۔

یہ یاد رہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات کی کل آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف ہوتی ہے

رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ بنام ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2' لاہور ارسال فرمائیں۔
بینک اکاؤنٹ نمبر 3082-7 برانچ کوڈ 0465 نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ' لاہور۔

(دستیاب پمفلٹس کی لسٹ اندرونی ٹائٹل کے پہلے اور آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔